مولانا انور شاہ محدث کشمیریؒ کی درسی تقاریر

مولوی سید محمد فاروق بخاری لیکچرار
شعبۂ عربی گورنمنٹ کالج سوپور

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ اپنے دور میں جہاں اپنی وسعت علمی اور حفظ و فراست میں معروف و مشہور ہوئے وہیں ایک مدرس کی حیثیت سے بھی اپنے وقت میں لاثانی ثابت ہوئے۔ جسوقت وہ دارالعلوم میں علم حدیث کا درس دیتے تھے۔ اس وقت ہندوستان کی سرزمین میں جلیل القدر مدرسین کا چراغاں تھا۔ مگر ان کے باوجود حضرت شاہ صاحب کے طریقۂ درس و تدریس نے ایک انفرادی حیثیت حاصل کی۔ بلکہ اسی کے طفیل دارالعلوم دیوبند عالم اسلام کی توجہ کا مرکز بنا۔

قبل اس کے کہ ہم حضرت شاہ صاحب کے "امالی" پر کچھ لکھیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے بحیثیت مدرس پر تھوڑی سی روشنی ڈالی جائے۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے اس موضوع پر ہی ایک بسیط مضمون لکھا ہے۔ مگر اپنے مخصوص طرز نے یہاں مولانا گیلانی کو دور دور تک پہنچایا ہے۔ اور موضوع زیر بحث کو بہت کم مس کر پائے ہیں۔ اگرچہ اس سے انکار نہیں ہے۔ کہ یہ مقالہ اہم معلومات بالخصوص تعزیات انور شاہ کا بہترین مجموعہ ہے، مولانا گیلانی کے علاوہ مولانا محمد یوسف بنوری[1]، مولانا محمد ادریس کاندھلوی[2]

---

[1] فیض الباری علی صحیح البخاری، مطبوعہ مصر۔ ج ۱ ص ۲۰ — ۲۳

[2] حیات انور: طبع دوم ص ۱۴۶ — ۱۴۸

اور مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ[1] نے بھی جامع الفاظ میں حضرتؒ کی درسی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسطرح حفظ و ذکا اور علم و تقویٰ ان کے وہبی کمالات ثابت ہوئے ایسے ہی تدریسی کمالات سے بھی وہ فطرۃً آراستہ تھے۔ جب وہ دارالعلوم دیوبند میں ایک مدرس کی حیثیت سے پہلے ہی دن درسگاہ میں داخل ہوجاتے ہیں تو ان کا اندازِ درس طلباء و مدرسین کے درمیان مورد بحث بن جاتا ہے مولانا محمود احمد غازیوتوی صدیقی اپنا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں :

"خوب یاد ہے کہ جب دفتر سے اس کا اعلان ہوا (کہ فقہ میں ہدایہ اولین اور ادب میں مقامات حریری نئے استاد پڑھائیں گے) تو طلبہ نے اس کا خیر مقدم نہیں کیا بلکہ چہ میگوئیاں تھیں کہ ہدایہ اور مقامات حریری جیسی کتابیں ایک نئے مدرس کے یہاں رکھ دینا غلطی ہے۔ مگر ہوا کیا۔ دارالعلوم کے اس وقت کے نقشہ کے حساب سے نودرہ کے جنوب میں جو آخری درسگاہ تھی اس میں پہلے ہی دن کے درس سے وہ طلبہ جو حسبِ عادت نئے مدرس کو تنگ کرنے کے لئے خوب تیار ہوکر گئے تھے، وہ حیرت زدہ ہوکر دھوم مچا رہے تھے۔ اور بول رہے تھے : واللہ انہ بحرٌ لاساحلَ لہ۔ یہ الفاظ ایک مستعد قازانی طالب علم مولوی محمد جان ترکی کے تھے۔ ہفتہ بھر میں ہی آپ کی جملہ علوم و فنون میں ایک مجتہد کی حیثیت سے اس طرح شہرت ہوگئی کہ جیسے کوئی شخص خلافِ عادت عرش سے اتر پڑا ہو۔"[2]

اسی پہلے سال کے شروعِ درس سے چند روز کے اندر اندر آپ کی بے مثل درسی عظمتوں کے شور و غل سے بعض فاضل مدرسین میں بھی بشری رنگ ابھر آیا اپنے درسوں میں وہ یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ کشف الظنون سے کتابوں اور مصنفین کے اسامی رٹنے میں وقت ضائع کرنے والے بھی دنیا میں مولوی ہوتے ہیں۔ پھر اصل حقیقت سامنے آجانے پر وہی اساتذہ اخیر تک آپ کی رفعتوں کو سر اونچا کرکے جھانکتے ہوئے خدا کی اس موہبتِ عظمیٰ کا برملا اقرار فرماتے تھے اور تلمیذانہ انداز سے استفادہ کی فرصتوں کو ضائع نہ ہونے دیتے تھے۔ فرحمہم اللہ رحمۃً واسعۃً۔[3]

---

[1] مولانا انور شاہ کشمیری : حیات اور کارنامے، علی گڑھ ۱۹۷۴ء : ملاحظہ ہو "پیشِ نظر"

[2] حیات انور : طبع دوم ص۔ ۵۹

[3] حیاتِ انور : طبع دوم ص۔ ۶۰

حضرت شاہ صاحب کے درسی کمالات نے نہ صرف ان کو عظمت و بلندی کے اونچے مقام پر فائز کیا بلکہ اس سے دارالعلوم دیوبند کو چار چاند لگ گئے دیوبند کے شدید مخالفین بھی دب گئے اور سنجیدہ مخالفین نے اپنے اختلافات کو ایک طرف رکھ کر دوستی و محبت کا قدم آگے بڑھایا۔ حضرت ہی کے زمانے میں جب کہ درس کی شہرت اوج کمال پر تھی، علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب احمد خان دیوبند تشریف لائے اور حضرت کے درس میں شمولیت کی اور درس ختم ہونے پر اپنا تاثر ان الفاظ میں پیش کیا:

"آج آکسفورڈ اور کیمبرج کے لیکچر ہال کا منظر سامنے آیا۔ یورپ کی ان یونیورسٹیوں میں پروفیسروں کو جیسے پڑھاتے ہوئے میں نے دیکھا آج ہندوستان میں میری آنکھوں نے اسی تماشا کو دیکھا۔[1]

یہ آپ کی تدریسی شان ہی ہے، جس نے مولانا ابوالکلام آزادؒ کو بھی آپ کو مدرسۂ عالیہ کلکتہ لانے کے لئے بے چین کر رکھا تھا[2] جب شاہ صاحب نے دارالعلوم دیوبند سے قطع تعلق کیا تو ڈابھیل کے معمولی مدرسے نے دوسرے دیوبند کی صورت اختیار کی اور دو ایک سال کے اندر اندر یہ حال ہوا۔ جیسا کہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

"مولانا انور شاہ صاحب، مولانا بشیر احمد اور مولانا سراج احمد نے یہاں دوسرا دیوبند قائم کیا بہت سے سرحدی اور ولایتی، بنگالی اور ہندوستانی طالب علم بھی ان کے ساتھ آئے اور چند سال تک زور و شور سے ان صاحبوں کا وہاں درس جاری رہا۔[3]

جاننے والے ہمیں یہ خبر دیتے ہیں کہ درس حدیث میں حضرت شاہ صاحب مختارات امام اعظم ابوحنیفہؒ کی تائید میں مواد پیش کرنے کی ممکن بھر کوشش کرتے تھے۔ عقائد اور معاملات میں بھی وہ اپنے اسلاف سے سرمو منحرف ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ تدریس و تعلیم کے اس طرز سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو ظاہر ہے مانوس اور متاثر نہیں ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ فکر و نظر کی آزادی یہاں محدود تھی۔ یعنی حضرت شاہ صاحب غیر مقلد ہونے کے باوجود مقلد نظر آتے ہیں۔ مگر ان ساری باتوں کے باوجود حضرت کی تحقیق کے آگے یہ تقلید، تقلید نہیں رہتی ہے۔

---

[1] حیات انور: طبع اول بحوالہ انوار الباری۔ ج ۲ ص ۲۴۵

[2] ذکر آزاد: عبدالرزاق ملیح آبادی، مطبوعہ کلکتہ ص ۴۸ - ۴۹

[3] "معارف" اپریل ۱۹۵۰ء

اصل بات یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب اگرچہ اپنے شیوخ واکابر کے نقوش ہی پر گامزن تھے مگر وہ تقلیدی طور پر ایسا نہیں کرتے تھے بلکہ تحقیقی طور پر کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی بے پناہ وسعت علمی سے دکھایا کہ ہمارے بزرگان دین ہی حق پر تھے، اور پھر اس حق کو آفتاب کی طرح نمایاں کرتے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت نے ہم عہد ہندوستان میں سب سے پہلے تنقید کا معیار بلند کیا۔ جو افراط وتفریط سے پاک ہے۔ علماء دیوبند میں پہلے حضرت نے ہی حافظ ابن تیمیہ کی عظمت وجلالت کا دقیع الفاظ میں اعتراف کیا۔ اور جگہ جگہ ان کے اقوال وافادات پیش کئے۔ دوسری طرف بلا کا حافظہ اور استحضار تھا۔ ان ساری چیزوں نے مل کر ان کے درس کو قابل رشک بنا دیا۔ مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ بڑے مؤثر الفاظ میں لکھتے ہیں :-

> "حضرت شاہ صاحب کے درس حدیث میں کچھ ایسی امتیازی خصوصیات نمایاں ہوئیں جو عام طور سے دروس میں نہ تھیں اور حضرت شاہ صاحب کا انداز درس درحقیقت دنیائے درس وتدریس میں ایک انقلاب کا باعث بنا۔"[1]

حضرت شاہ صاحب ہندوستان کی اسلامی درسگاہوں کے مدرسین میں وہ منفرد مدرس تھے۔ جن کے سامنے درس وتدریس کے چند اصول اور قواعد تھے۔ وہ خود فنا فی العلم تھے۔ اُن کے علم کو ان کا قوتِ حافظہ ہر وقت تیار رکھتا تھا۔ دوسری طرف وہ ایک عالم دین ہونے کے باوجود علم میں تنگ نظر واقع نہ ہوئے تھے وہ علومِ عقلیہ اور علومِ جدیدہ سے بھی بہرہ ور تھے، ان اوصاف وکمالات نے ان کو کامیاب بنا دیا۔ جو ان کی مجلس میں بیٹھتا وہ جھومتا، اُن کے بعد پھر کبھی دارالعلوم دیوبند نے اس شان کا مدرس پیدا نہیں کیا۔ ۱۹۱۲ء میں جب علامہ رشید رضا مصری ندوۃ العلماء لکھنؤ یہاں سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور آخر میں علی گڑھ سے دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تو علامہ مرحوم نے یہاں کے جاننے کی خواہش ظاہر کی کہ یہاں علم حدیث کیسے پڑھایا جاتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اسکی وضاحت اپنی جوابی تقریر میں جس طریقہ پر کی اس کا اندازہ اُسے پڑھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ اس مختصر مگر پُر مغز تقریر میں درس وتدریس کے قواعد اور ملحوظات بیان کئے۔ خاص طور پر "فقہ حدیث" اور "درس الحدیث"[2] کی وضاحت کر کے بتایا کہ ہم کسطرح احادیث کو روایت ودرایت کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور یہ کہ ہم بحث کے دوران تحقیق مناط تخریج مناط اور تنقیح مناط کو کام میں لاکر

---

[1] حیاتِ انور: طبع دوم۔ ص ۲۳۵

[2] نفحۃ العنبر: مولانا محمد یوسف بنوری ص ۲۸

فکر و فہم کا دامن بھی نہیں چھوڑنے۔ اسی طرح پورے اعتماد کے ساتھ تائید مذہب حنفی کی بحث چھیڑ دی اور مثالوں سے سمجھایا کہ ہم یہ تائید آنکھ بند کر کے نہیں کرتے بلکہ پہلے خوب تحقیق و تفحص کرتے ہیں۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ یہ تقریر سننے کے دوران علامہ مصری بار بار یہ الفاظ دہراتے تھے۔

"ما رایت مثل ھذا الاستاذ الجلیل قط" [1]

علامہ رشید رضا مسلکاً شافعی تھے اور حضرت شاہ صاحب امام ابوحنیفہ کے شیدائی۔ اس اختلافِ مسلک کے باوجود جب حضرت شاہ صاحب نے اپنے درس و تدریس کے ضوابط بیان کئے۔ تو علامہ نے یہ کہہ کر اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔

شیخ انور شاہ نے جو اصول میرے سامنے بیان کئے اور جو مسلک اپنے ۔۔۔۔۔ مشائخ کا مجھے بتلایا میں اسکو پسند کرتا ہوں۔" [2]

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے مسلک اور طریقہ درس کے بعد اس کا بھی صاف اعتراف کیا کہ مدرسہ ابھی طریقۂ تعلیم میں اصلاح کا محتاج ہے اور پھر اپنے اصلاحی خیالات بیان کئے جن کو سن کر علامہ نے اپنی جوابی تقریر میں فرمایا ؛

"حضرات! اصلاح طریقۂ تعلیم کے متعلق جو خیالات میں نے آپ کے سنے ہیں، میں ان کو غیبی بشارت سمجھتا ہوں۔" [3]

اس تقریر کے بعد حضرت شاہ صاحب نے پورے پندرہ سال تک نہایت تحقیق و اتقان کے ساتھ دیوبند میں درس دیا۔ اور اس دوران میں وہ ساری کی پوری کر دی جسکی طرف علامہ مصری کے روبرو اشارہ کیا تھا۔ پھر تو حال یہ ہوا (بالفاظ علامہ سید سلیمان ندویؒ)

"حضرت شیخ الہندؒ کے زمانہ جنگ میں ہجرت کے بعد سے ۱۹۲۹ء تک صدر مدرسی کا عہدہ اس خوبی سے انجام دیا کہ چین سے لیکر روم تک ان کے فیضان کا سیلاب موجیں لیتا رہا۔" [4]

---

[1] مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ج ۱

[2] التربیۃ والتعلیم : یعنی تقاریر علامہ رشید رضا مصری علی گڑھ ص ۔ ۱۲۱

[3] ایضاً ص ۱۲۷

[4] "معارف" جولائی ۱۹۳۶ء : شذرات

مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں :-

اشتغل بتدریس سنن الترمذی وصحیح البخاری وانتهت الیه رئاسة تدریس الحدیث فی الهند وبقی مشتغلاً به مدة ثلاث عشرة سنة فی تحقیق واتقان وتوسع فی نقل المذاهب ودلائلها واستحضار المنقول واطلاع علی دواوین السنة وشروح الحدیث وکتب المتقدمین۔ [1]

یعنی حضرت شیخ جامع ترمذی اور صحیح بخاری پڑھانے میں مشغول ہوئے اور پورے ہندوستان میں تدریس حدیث کی سرداری انہی پر ختم تھی پورے تیرہ سال تک نہایت تحقیق اور رسوخ کے ساتھ یہ خدمت انجام دی درس مذہب مختلفہ اور ان کے دلائل پوری شرح وبسط کے ساتھ نقل کرتے تھے یہ سارے نقول مستحضر تھے۔ نیز علم حدیث کے جملہ ذخیرے اس کے شروح اور متقدمین کی تصانیف پر پوری آگاہی تھی۔

...

یہ مولانا انور شاہ صاحب کی یگانہ تدریسی شان ہی تھی کہ ان کے حلقۂ درس میں بیٹھنے والے ان کے دروس وتقاریر قلمبند کرنے کی ممکن بھر کوشش کرتے تھے ان کے معاصرین میں شاید ہی کسی عالم دین کے اتنی تعداد میں امالی لکھے گئے ہوں گے، جتنے حضرت شاہ صاحبؒ کیطرف منسوب ہیں۔ ان میں چند زیور طبع سے آراستہ ہوئے ہیں۔ کچھ مخطوطات کی شکل میں ابھی تک یوں ہی پڑے ہیں۔ اور کچھ اہل علم کے امالی ضائع ہوئے ہیں۔ مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ نے حضرتؒ کی اکیس کتابوں کا ذکر کیا ہے جن میں ۱۴ تصانیف ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ اور باقیہ سات آپ کے درسی تقاریر یا افادات ہیں جن کی آپ کے تلامذہ نے ترتیب دے دی ہے۔ قاری رضوان اللہ صاحب نے مزید پانچ کتابوں کا اضافہ کیا ہے [2] جو یہ ہیں :- ۱- دعوت حفظ ایمان ۲- خلاصۂ تقاریر حضرت علامہ کشمیریؒ ۳- النور الفائض علی نظم الفرائض۔ ۴- الاتحاف المذہب الاحناف ۵- معارف السنن، اگر معارف السنن

اگر معارف السنن بھی حضرتؒ کی فہرست تصانیف میں شامل کی جائے تو مولانا احمد رضا صاحب بجنوری کی ترتیب دی ہوئی دو کتابیں " انوار الباری علی صحیح البخاری " اور نظم النور، بطور ملحق اولیٰ شامل کرنے کے قابل ہیں۔ راقم کے پاس حضرتؒ کی ایک نظم ہے جسکی مولانا محمد ادریس سکھروڈوی نے شرح لکھی ہے یہ نظم ——

---

[1] نزهة الخواطر ج : ۸ ترجمہ : الشیخ انور شاہ الکشمیریؒ

[2] مولانا انور شاہ کشمیریؒ : حیات اور کارنامے، مطبوعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

" الکفار الملحدین فی شئی من ضروریات الدین ۔" میں بھی دیکھی جا سکتی ہے ۔ مولانا سکھروڈوی کی یہ شرح " صدع النقاب عن جساسۃ الفنجاب " کے نام سے ۱۹۲۵ء میں مطبع قاسمی دیوبند سے شائع ہوئی ہے ۔ رسالہ چوبیس صفحات پر مشتمل ہے ۔

اب ہم حضرتؒ کی درسی تقاریر پر روشنی ڈالتے ہیں جو اس مقالے کا موضوع ہے ۔ پہلے ان "امالی" کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو گم ہوئی ہیں یا چوروں نے چرائی ہیں اور کتابوں میں صرف ان کا ذکر ملتا ہے ۔ ممکن ہے کسی وقت کسی صاحب علم کے ہاتھ یہ آجائیں اس طرح یہ علمی سرمایہ محفوظ رہے ۔

۱۔ امالی صحیح مسلم از مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی الحسنی (برادر اکبر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) ڈاکٹر صاحب مرحوم حضرت شیخ الہند اور علامہ انورشاہ کشمیری کے اخص تلامذہ میں سے تھے ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں :-

کان من اساتذتہ الکبار العلامۃ الکبیر الشیخ انور شاہ الکشمیری و کان معجباً بجودۃ فہمہ وحسن تقلیدہ للدرس [1]	ان کے بلند پایہ اساتذہ میں علامہ الکبیر شیخ انورشاہ کشمیری تھے ۔ جنہیں ان کے سرعتِ فہم اور اسباق سلیقہ سے لکھنے پر تعجب اور فخر تھا ۔

ڈاکٹر صاحب موصوف بھی حضرت شاہ صاحب کے درسی تقاریر قلمبند کرتے تھے ۔ ان کے ایک مکتوب سے جو انہوں نے معتمد انوریہ لائبریری دیوبند کو لکھا ہے ۔ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے شاہ صاحبؒ کے پاس ابوداؤد پوری اور صحیح مسلم کا بڑا حصہ پڑھا تھا ۔ اور دونوں کتابوں کے اہم تقاریر نوٹ کئے تھے اسی خط میں لکھتے ہیں :-

" حضرت کی تقریروں میں بعض ایسے مضامین ہوتے تھے جو حضرت سے پیشتر کسی نے بیان نہیں کئے ۔ " [2]

مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی نظروں سے یہ مجموعہ گزرا ہے (بلکہ مطالعہ بھی کیا ہوگا) وہ لکھتے ہیں :

" ان تقریروں پر مولانا انورشاہ صاحبؒ کی نظر پڑی تھی اور انہوں نے ان کو پسند کیا اور کہیں کہیں اپنے قلم سے تصحیح و اضافہ بھی فرمایا ۔ " [3]

---

[1] البعث الاسلامی ، لکھنؤ ، عدد ممتاز شوال ۱۳۹۵ھ ص ۱۵۵

[2] بحوالہ انوار الباری ج ۲ ص ۲۵۷ [3] حیات عبدالحی ، ندوۃ المصنفین دہلی ص ۳۵۳

مگر حضرت مولانا ندوی افسوس کے ساتھ آگے لکھتے ہیں کہ :-

"یہ مجموعہ میری غفلت سے تلف ہوگیا ہے کسی صاحب نے مطالعہ کے لئے لیا پھر واپس نہ کیا۔ بھائی صاحب مرحوم کو اس کا بہت افسوس رہتا ہے"۔ [1]

ڈاکٹر صاحب نے مذکورہ بالا مکتوب میں لکھا ہے کہ اس مجموعہ کی نقل اور فضلاء نے نقل لے لی تھی ایک جناب خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی (شاگرد مولانا انورشاہ صاحبؒ) اور دوسرے خلیل بن محمد الیمانی مولانا ابوالحسن صاحب کے استاد، خدا کرے ان بزرگوں میں سے کسی کے پاس یہ مجموعہ موجود ہو۔

۲۔ دوسرا مجموعہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کا لکھا ہوا تھا۔ اس کا انکشاف جناب مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدظلہٗ نے کیا ہے۔ اپنے ایک مضمون میں مولانا اکبرآبادی صاحب لکھتے ہیں :-

"میں (مولانا اکبرآبادی صاحب) جس سال دورۂ حدیث میں تھا اس سال بھی یہ (حضرت مجاہد ملت) صحیح بخاری کی سماعت بڑی پابندی سے کر رہے تھے۔ اور میرے لئے حضرت شاہ صاحب کی تقریر قلم بند کرتے تھے۔ میرے پاس بھائی حفظ الرحمٰن صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ دو موٹی موٹی کاپیاں محفوظ تھیں مگر ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں جب گھر لٹا تو وہ کاپیاں بھی نہ رہیں۔ [2]

۳۔ مجموعہ افادات مرتبہ مولانا قاری محمد طیب صاحب۔ مولانا مدظلہٗ نے بھی خود اس ضخیم مجموعہ کا ذکر کیا ہے۔ اس میں انہوں نے مختلف الانواع تحقیقات جمع کئے تھے مگر یہ مجموعہ بھی تلف ہوا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں :

"میں نے ان مختلف الانواع تحقیقات کو دیکھ کر ایک املائی کاپی تیار کی جس کے چوڑے اوراق میں چھ سات کالم بنائے اور ہر کالم کے اوپر والے سرے پر فنون کے عنوان ڈال دیئے، یعنی مباحث حدیث و مباحث تفسیر، مباحث عربیت (صرف و نحو) مباحث فلسفہ و منطق و مباحث ادبیات (جن میں اشعار عرب اور فصاحت و بلاغت کی بحثیں آتی تھیں۔ مباحث تاریخ وغیرہ۔ پھر فنون عصریہ کے لئے ایک کالم رکھا۔ کیونکہ موجودہ دور کے فنون جیسے سائنس، فلسفہ جدید اور ہیئت جدید وغیرہ کے مباحث بھی بذیل بحث حدیث میں آتے تھے۔ میں کالم وار ان مباحث کو املا کرتا جاتا تھا۔ ان فنی مباحث کے

---

[1] حیات عبدالحی، ندوۃ المصنفین دہلی۔ ص ۳۵۳

[2] الجمعیۃ۔ دہلی۔ مجاہد ملت نمبر ۱۹۶۳ء ص ۱۲۵

کالموں کے سرنامہ پر عنوان تھا : قال الاستاذ اس میں وہ فیصلے درج کر لیا کرتا تھا۔ جو مسائل کی تدقیق و تنقیح کے بعد بطور آخری نتیجہ کے حضرت یہ کہہ کر ارشاد فرمایا کرتے کہ میں کہتا ہوں ؛

"افسوس کہ یہ بیاض جو تقریباً چار سو پانچ سو صفحات پر مشتمل تھی ایک کرم فرما طالب علم نے مستعار مانگی اور میں نے اپنی طالبعلمانہ ناتجربہ کاری سے چند روز کے لیئے ان کے حوالہ کر دی۔ انہوں نے وہی کیا جو کتاب کو عاریتہً مانگنے والے طلبہ کرتے ہیں یعنی چند دن کے بعد میرے مطالبہ پر فرمایا کہ میں تو دے چکا ہوں آپ کو یاد نہیں رہا۔" (حیات انور ص ۲۴۱)

اس طرح سے یہ ذخیرہ جس کو حضرتؒ کے بہت ہی قریبی شاگرد نے کافی محنت کے بعد تیار کیا تھا کھو گیا۔

۴۔ امالی از مولانا عبدالقدیر و مولانا عبدالعزیز : یہ دونوں حضرات مولانا انورشاہ صاحبؒ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ دونوں بزرگوں نے مدرسہ اسلامیہ ڈابھیل میں درس بھی دیا ہے۔ مولانا عبدالقدیر نے ڈابھیل کے بعد مدرسہ عربیہ فقیر والی ریاست بہاولپور میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے بھی کام کیا ہے ، ان دو فضلاء نے بھی حضرت شاہ صاحب کے درسی تقاریر قلمبند کئے تھے جو معلوم نہیں آج موجود ہیں یا نہیں ، البتہ مولانا بدر عالم صاحب میرٹھیؒ نے فیض الباری علی صحیح البخاری میں ان سے استفادہ کیا ہے اور کئی مقامات پر ان کا حوالہ بھی دیا ہے اور اقتباسات بھی پیش کئے ہیں جن کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مجموعے تحقیقات و نوادرات کے گراں قدر خزانے ہوں گے فیض الباری کے مقدمہ میں مولانا بدر عالمؒ نے صراحت کیساتھ لکھا ہے۔

"نحمد اللہ عزّ وجلّ ما رزقنی من تقریری الفاضلین اللّذین قرأ علیہ الصحیح ثلاث مرات ضبطا عنہ ما ضبطا بعد تدرب لیل ونہارا عنی بہما الفاضل عبدالقدیر وعبدالعزیز الأستاذین بالجامعۃ الاسلامیۃ فلا اغمط برھما مادمت حیا۔"

یعنی اللہ کا شکر ہے کہ مجھے دو ایسے فضلاء نے تقاریر عطا کئے جنہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے پاس تین مرتبہ صحیح بخاری کا درس لیا اور دن رات عادی بن کر دروس و افادات قلمبند کئے۔ میری مراد فاضل عبدالقدیر اور فاضل عبدالعزیز (کاملپوری) سے ہے جو جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے اساتذہ بھی ہیں۔ میں تادم آخر ان کے احسان کا شکر گزار رہوں گا۔

(بشکریہ۔ برھان۔ دھلی)